تزکیۂ نفس

کتمانِ علم کے اسباب اور اس کا علاج

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

بسلسلۂ گذشتہ

خوف اور طمع دوسری چیز جو آدمی کو جانتے بوجھتے امرِ حق کے اظہار و بیان سے روک دیتی ہے وہ طمع یا خوف ہے۔ جن لوگوں سے آدمی اپنا کوئی دنیوی مفاد وابستہ کر لیتا ہے یا جن سے اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ان کی خواہشات کے خلاف اس نے کوئی بات زبان سے نکالی تو وہ اس کو نقصان پہنچا دیں گے۔ ان کے سامنے کسی ایسے حق کا اظہار جو ان کو پسند نہ ہو ایک کمزور آدمی کے لیے نہایت دشوار ہے۔ ہمارے اندر کتنے واعظ اور خطیب ہیں جو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ کر گھنٹوں داد خطابت دیتے ہیں لیکن وہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرتے جس کو ان کے سامعین پسند نہ کرتے ہوں، اگرچہ دین کے اندر وہ بات کتنی ہی پسندیدہ اور مسلمہ حقیقت کیوں نہ ہو۔ کتنے عالمانِ دین ہیں جو دین کی فروعی باتوں پر تو روز مباحثے اور مناظرے کے مورچے قائم کرتے پھرتے ہیں لیکن جانتے بوجھتے اُن مخالفِ دین بلکہ ہادمِ دین سرگرمیوں کے مقابل میں بالکل گونگے بہرے بن جاتے ہیں جن کے متعلق ان کو اندیشہ ہو کہ اگر ان کے خلاف زبان ہلائی تو اربابِ اقتدار کی ناراضگی مول لینی پڑے گی۔ کتنے دینی مدارس ہیں جو دین کی تبلیغ و تعلیم کے نام پر کھولے جاتے ہیں لیکن وہ اصل دین سے زیادہ ان لوگوں کی خوشنودی اور رضاجوئی کا اہتمام کرتے ہیں جو ان کو چندہ دیتے ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔ یہی حال عام طور پر مصنفوں اور مولفوں کا ہے، یہی رنگ ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا ہے۔ حد یہ ہے کہ یہی انداز عام طور پر تزکیۂ نفس کرنے والے مربیوں اور مرشدوں کا بھی ہے، وہ بھی اپنے روحانی مریضوں کے علاج اور پرہیز دونوں میں استیصالِ مرض سے زیادہ مریضوں کی پسند و ناپسند اور ان کی خواہشوں ہی کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان باتوں کو بیماری کہنے کے بجائے صحت ہی کہنا پسند کرتے ہیں جن کو بیماری کہنا کم از کم ان کے مالدار اور بااثر مریدوں کو ناگوار ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ علماء کے سینوں سے علم کو کس چیز نے نکالا؟ انہوں نے جواب دیا نہ طمع نے (مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)

اس تمام کتمانِ علم کو مصلحت بینی پر محمول کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس جہل و فساد کے زمانہ میں لوگوں کو سارا دین بتلانے کی کوشش کی جائے تو لوگ اس کا بوجھ سہار نہ سکیں گے بلکہ اندیشہ ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بھی چھوڑ بیٹھیں بعضوں کے نزدیک دین کے اُن اجزا کا بیان کرنا جن کو ارباب اقتدار پسند نہیں کرتے ان سے ٹکر لینے کے ہم معنی ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی خارجیت ہے۔ بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ جن امور میں مسلمان ایک خاص پہلو پر جم گئے ہیں، اگرچہ وہ غلط ہی سہی، اب ان پر کلام کرنا لوگوں کے ذہنوں کو تشویش میں ڈالنا ہے۔ الغرض مختلف مصلحتیں ہیں جن کو اس علم پوشی کے لیے بہانہ بنایا جا رہا ہے حالانکہ یہی چھوٹی مصلحت پرستیاں اور بہانہ بازیاں ہیں جنہوں نے معاملہ کو یہاں تک پہنچایا ہے۔

مصلحت کی اہمیت سے ہم کو انکار نہیں ہے لیکن دین کی مصلحت اور اپنی ذاتی مصلحت میں بڑا فرق ہے۔ دین کی مصلحت پر نگاہ رکھنے والے تو یہ سوچتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی ہر بات بہرحال ہمیں لوگوں تک پہنچانی ہے البتہ یہ لحاظ رکھنا ہے کہ ہر بات صحیح وقت پر، صحیح طریقہ سے، صحیح مخاطب کو پہنچے۔ لیکن جو لوگ صرف اپنی ذاتی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ کن باتوں کا بتانا اور سکھانا ہمارے مصالح کے موافق ہوگا اور کن باتوں کے اظہار سے ان مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روش خدا کے دین کے ساتھ صریح چالبازی ہے اور اگر کوئی شخص اس کو مصلحت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو وہ درحقیقت صریح منافقت کو مصلحت کا نام دینا چاہتا ہے۔

مسلمانوں سے اللہ کے رسول ؐ نے جن باتوں پر عہد لیا ہے، عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق ان میں ایک نہایت اہم بات یہ بھی شامل ہے کہ

وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری)

اور اس بات پر ہم سے بیعت لی کہ ہم حق کہیں جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں۔

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے معاشرہ کے ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لیجیے جن پر حق کے اظہار و اعلان کی اصلی ذمہ داری ہے کہ وہ کس حد تک اس کو نباہ رہے ہیں۔ یہ حدیث تو منبر سے لے کر دار تک اور مدرسہ و مسجد سے لے کر بادشاہوں کے دربار تک ہر جگہ حق کے اعلان کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن یہاں حال یہ ہے کہ لوگ دین کے معاملہ میں بڑی بڑی دھاندلیاں دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ دھاندلی ہے ظلم ہے، بہتان ہے، لیکن اس کے خلاف محض اس اندیشہ سے زبان نہیں کھولتے کہ کہیں اپنے گروہ اور برادری سے خارج نہ کر دیئے جائیں یا اپنے حلقہ کے لوگوں کے طعن و تشنیع کا ہدف نہ بننا پڑے۔

مشکوٰۃ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے ایک طویل حدیث، ترمذی کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے جس کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

ولا یمنعن احدا منکم ھیبۃ الناس ان یقول بحق اذا علمہ وفی روایۃ ان رای منکرا ان یغیرہ فبکی ابو سعید وقال قد رأینا ہ فمنعتنا ھیبۃ الناس ان نتکلم فیہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ایک حق کو جانتے ہو تو لوگوں کا خوف اور رعب تمہیں اس کے اظہار سے مانع نہ ہو اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کی اصلاح سے لوگوں کا خوف مانع نہ ہو۔ ابو سعید یہ بیان کر کے رونے لگے کہ آج ہم منکر باتیں دیکھ رہے ہیں لیکن لوگوں کے خوف نے ہمیں ان کے بارے میں زبان کھولنے سے روک دیا ہے۔

حضرت ابو سعیدؓ اس زمانہ کے حالات پر نگاہ کر کے رونے لگے جبکہ حق کی پامالی اور مظلومی کے واقعات کہیں شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتے تھے اور اگر آتے بھی تھے تو جان کی بازیاں کھیل کر اس حق کی حمایت و نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے بھی معاشرے میں کم نہیں تھے۔ بنو امیہ کے دور میں بعض سفاکوں کی خون آشامی ضرب المثل رہی ہے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اگر حق کے لیے اتنے بے شمار سر کٹنے کے لیے موجود نہ ہوتے تو ان سفاکوں کی خون آشامی کو یہ شہرت دوام کہاں سے حاصل ہوتی؟ البتہ رونے کا

زمانہ آج ہے جبکہ حق پوشی ہی کو دین بنا لیا گیا ہے اور مطعون وہ نہیں کیے جاتے جو حق کو قتل کرتے یا اس کو چھپاتے ہیں بلکہ وہ لوگ کیے جاتے ہیں جو حق کے اظہار و اعلان کی جرأت کرتے ہیں۔

بے حمیتی کتمانِ علم یا کتمانِ حق کا ایک سبب بے حمیتی اور بے غیرتی بھی ہے۔ حق اور علمِ حق ایک متاعِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ہر شخص کے اندر ان کی حفاظت اور ان کی حمایت و نصرت کے لیے غیرت و حمیت ہونی چاہیے۔ اللہ اور رسول نے علم و عرفان کے جو چراغ جلائے ہیں وہ سب کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہیں، اس وجہ سے اگر ان میں سے کوئی چراغ بھی گل کیا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کو روشنی سے محروم کیا جا رہا ہے۔ پس ہر شخص کا فرض ہے کہ ان چراغوں کی حفاظت کرے اور ان کے گل کرنے والے کا اسی طرح ہاتھ پکڑے جس طرح خاص اپنے گھر کے چراغ کے چھیننے جانے پر وہ چھیننے والے کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حقوق قائم کر دیئے ہیں، جو حدود مقرر کر دیئے ہیں، اور ہماری سلامتی کے لیے جو قوانین بنا دیئے ہیں وہ سب بھی متاعِ مشترک کی نوعیت رکھتے ہیں، ان کی سلامتی میں سب کی سلامتی اور ان کی بربادی میں سب کی بربادی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے امکان کی حد تک ان کی حفاظت کرے اور ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر ایک شخص کا مال لٹتا ہے لیکن پاس پڑوس کے لوگ اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھتے، اگر ایک شخص قتل کر دیا جاتا ہے لیکن علم رکھنے والے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی مدد نہیں کرتے، اگر ایک عفیفہ کی آبرو برسرِ بازار لٹتی ہے لیکن دیکھنے والے دم سادھ لیتے ہیں، نہ مظلومہ کے بچانے ہی کے لیے اٹھتے اور نہ ظالم کے مقابل میں شہادت ہی دینے کے لیے تیار ہوتے، اگر دین و شریعت کے اصولوں کی بھری مجلس میں توہین ہو رہی ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، لیکن مجلس کے بڑے بڑے ثقات کے کانوں پر بھی غیرت کی جوں نہیں رینگتی تو صاف الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے اندر خود اپنی عزت، خود اپنے ناموس اور خود اپنے جان و مال کے لیے بھی کوئی احساسِ غیرت باقی نہیں رہا ہے اور وہ اس بات پر راضی ہیں کہ خود ان کی ماں یا بہن یا بیٹی کی عزت و آبرو خود ان کے سامنے لٹے اور وہ اس کا تماشہ دیکھیں۔ قرآن نے حق کے متاعِ مشترک ہونے کے اسی اصول کی بنیاد پر یہ فرمایا ہے کہ:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۳۲- مائدہ)	جس نے کسی شخص کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا کہ اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا اس نے سب کو زندہ کیا۔

غور کیجیے کہ قاتل اگر کسی کو ناحق قتل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ سب کو کس طرح قتل کر دیتا ہے۔ اور اگر ایک شخص کسی کو ناحق قتل ہونے سے بچا لیتا ہے تو وہ سب کو کس طرح زندہ بچا لیتا ہے؟ وہ اسی طرح کہ قاتل درحقیقت حرمتِ جان کے اس مقدس اور ابدی قانون کو قتل کر دیتا ہے جو سب کی جانوں کا محافظ ہے۔ اور ایک بچا لینے والا اس قانون کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت میں سب کے لیے امان ہے۔ اس سے یہ بات لازمی طور پر نکلتی ہے کہ کسی معاشرہ کے اندر ہر قتل، ہر بے آبروئی، ہر ظلم کو انفرادی حیثیت میں دیکھنے کے بجائے اس کو اجتماعی حیثیت میں دیکھا جانا چاہیے، گویا ہر شخص قتل ہوا، ہر شخص کی بے ناموسی ہوئی، ہر شخص پر ظلم ہوا اور پھر اسی حیثیت سے اس کے خلاف پورے معاشرہ کے اندر ایک کھلبلی پائی جانی چاہیے۔ اگر یہ کھلبلی نہ پیدا ہو تو یہ چیز پورے معاشرہ کی بے حسی اور بے حمیتی کی دلیل ہے اور ایسے معاشرہ کے اندر نیکی اور سچائی کے تمام نشانات یکے بعد دیگرے معدوم ہو کے رہتے ہیں۔ اور پھر سب کے سب ظلم، جہالت، اور تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر گھر جاتے ہیں۔

یہ بے حمیتی مختلف صورتوں میں معاشرہ پر چھاتی ہے۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور وہ تدریج ہر شعبہ زندگی پر چھانے لگتا ہے لیکن وہ لوگ جو بگاڑ کی اصلاح کر سکتے ہیں اپنے انفرادی تزکیہ میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہر طرح کے فسق و فجور کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے مسند و سجادہ کے حدود سے باہر جھانک کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ کی شریعت کی ہر جگہ علانیہ بے حرمتی ہوتی ہے لیکن یہ اپنے حال میں مست پڑے رہتے ہیں، ان کی پیشانی پر غیرت کی ایک لہر بھی نہیں اٹھتی۔ جب معاملہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ

ایسے معاشرہ پر اپنا غضب نازل فرماتا ہے اور پھر اس وقت جس طرح اصلی مجرمین پر خدا کا غضب بھڑکتا ہے اُسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اُن اتقیاء و زہاد پر یہ غضب بھڑکتا ہے جن کی ناک کے نیچے یہ سارا فساد پرورش پاتا رہا اور وہ گونگے بہرے بنے ہوئے اس کا تماشہ دیکھتے رہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو

عن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اوحى الله عز وجل الى جبريل عليه السلام ان اقلب مدينة كذا وكذا باهلها فقال يا رب ان فيهم عبدك فلانا لم يعصك طرفة عين قال فقال اقلبها عليه وعليهم فان وجهه لم يتمعر فى ساعة قط (مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو اس کے باشندوں سمیت الٹ دو۔ جبرئیل نے عرض کی کہ اے رب، اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو الٹ دو کیونکہ اُس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تھوڑی دیر کے لیے بھی متمایا نہیں۔

اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتے دیکھ کر جو لوگ اس کی اصلاح کی صلاحیت رکھنے والے ہوتے ہیں وہ اس کی اصلاح کے لیے اٹھتے تو ہیں لیکن ان کے اندر وہ لگن نہیں ہوتی جو اس راہ میں اترنے والوں کے اندر ہونی چاہیے۔ وہ اس راہ کی مشکلات کے مقابلہ کے لیے اپنے اندر دم داعیہ نہیں رکھتے۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح تو ہو لیکن اس طرح کہ نہ تو کسی کی ناراضگی مول لینی پڑے اور نہ کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ وہ سانپ کو تو مارنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے اپنی عصائے مقدس کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی عام روش یہ ہوتی ہے کہ وعظ کی مجلسوں میں وہ وعظ فرما دیتے ہیں، درس کے حلقوں میں قرآن و حدیث کے درس دے دیتے ہیں، معاشرہ کی برائیوں پر کبھی کبھی چیختے ہوئے۔ کچھ طنز بھی فرما جاتے ہیں، کبھی کبھی مرشدانہ انداز میں کچھ دردمندانہ نصیحتیں بھی سنا جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اسی رو میں بہے بھی چلے جاتے ہیں جس رو میں سب بہ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے بہنے اور دوسروں کے بہنے میں اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو بس یہ

ہوتا ہے کہ دوسرے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو بہاؤ کے رُخ پر ڈال دیتے ہیں اور یہ بہنے والوں کے ساتھ بہتے ہوئے کبھی کبھی یہ بھی یاد دہانی کرتے جاتے ہیں کہ "ہم کہتے نہ تھے کہ یہ تم غلط سمت میں بہے جا رہے ہو"۔ ظاہر ہے کہ اگر اصلاح کی محض خواہش ہو اور برائیوں کے خلاف حق کی حمایت کے لیے وہ سچی حمیت نہ ہو جو آدمی کو اس بات پر مجبور کر دے کہ اگر لوگ غلط سمت میں بگ ٹٹ چلے جا رہے ہیں تو وہ ھٰذا فراق بینی وبینک کہہ کر اپنی راہ بدل لے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ اس سے اس کے کن کن مفادات پر زد پڑتی ہے تو اس خواہشِ اصلاح کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ اور وہ اپنے آپ کو اس انجام سے کس طرح بچا سکتا ہے جو اس طرح کے بگاڑ کے لیے مقدر ہے؟

اس حقیقت کو مندرجۂ ذیل حدیث سے سمجھیے۔

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں بگاڑ کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب کوئی شخص کسی ایسے شخص سے ملتا جو کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا تو وہ اس سے کہتا کہ اے فلاں، اللہ سے ڈرو اور یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باز آؤ، یہ بات تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ لیکن جب وہ دوسرے دن اس سے ملتا اور دیکھتا کہ وہ اپنی اسی روش پر قائم ہے تو اس کے اندر اتنی غیرت نہ پیدا ہوتی کہ وہ کھانے پینے، اور مل بیٹھنے میں اس کا ساتھی بننے سے انکار کر دے۔ جب لوگوں نے یہ کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی تھوپ دی۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ، کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ، تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْھُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَھُمْ اَنْفُسُھُمْ ... اِلٰی قَوْلِہٖ فَاسِقُوْنَ .... (بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے، کسی منکر سے جس کو وہ کر رہے ہوتے تھے باز نہیں آتے تھے، کیا ہی برا تھا وہ کام جو وہ کر رہے تھے۔ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ انہی کو دوست رکھتے ہیں جنہوں نے کفر کیا، کیا ہی برا ہے وہ توشہ جو

انہوں نے اپنے لیے فراہم کیا . . . . لفظ فاسقون تک حضور نے یہ آیت پڑھی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں، یا تو یہ ہوگا کہ تم نیکی کا حکم دو گے، برائی سے روکو گے، ظالموں کا ہاتھ پکڑو گے اور انہیں حق پر قائم رہنے پر مجبور کرو گے یا یہ ہوگا کہ تم میں سے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی چھا جائیگی پھر اللہ تم پر بھی اسی طرح لعنت کر دیگا جس طرح اس نے ان پر لعنت کی "

یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں۔ یہی حدیث ترمذی میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے ۔

"جب بنی اسرائیل برائیوں میں مبتلا ہونے لگے تو شروع شروع میں ان کے علماء نے ان کو رد کا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو باز ہی نہیں آتے تو انہوں نے ان کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ نے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسرے گروہ کے دلوں پر بھی تھوپ دی اور ان کی نافرمانی اور زیادتی کی پاداش میں داؤد اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے، یہ فرماتے ہوئے آپ اٹھ بیٹھے اور پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں، اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، جب تک تم انہیں حق کی طرف موڑ نہ دو اس وقت تک تم خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے "

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جس طرح وہ شخص بے حمیت اور خدا کی لعنت کا مستحق ہے جو سرے سے معاشرے کے اندر ابھرنے والی برائیوں کے خلاف زبان ہی نہیں کھولتا، اسی طرح وہ شخص بھی بے حمیت اور غضب الٰہی کا مستحق ہے جو زبان تو برائیوں کے خلاف کھولتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی تنقیدیں لوگوں کا رخ پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ غیرت کا ثبوت دے اور ان سے اپنے آپ کو علیحدہ کرے انہی کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بنا رہتا ہے۔ اس طرح کے لوگ حق کا اظہار تو دبی زبان سے کرتے ہیں لیکن باطل کی تائید اپنے کھلے عمل سے کرتے ہیں اس وجہ سے خدا کے ہاں ان کی ان بے جان تنقیدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بلکہ ان کا شمار بھی کاتمین حق ہی میں ہوتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جتنا کتمانِ حق اس طرح کے لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے اتنا شاید دوسروں کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔

مداہنت | کتمانِ حق کا چوتھا سبب مداہنت اور چشم پوشی ہے۔ آدمی جن لوگوں سے قرابت و رشتہ داری رکھتا ہے، جن سے اس کے دوستانہ روابط ہوتے ہیں، جن کو وہ اپنے خاندان اور برادری کا سمجھتا ہے یا جن کے لیے اس کے دل میں احترام و عقیدت کا جذبہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کے سامنے اظہارِ حق میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ وہ ایک معاملہ میں صاف جانتا ہے کہ حق کیا ہے لیکن محض اس وجہ سے وہ سچی شہادت دینے سے یا تو کترا جاتا ہے یا صریح جھوٹ بول دیتا ہے کہ معاملہ اس کے کسی عزیز و قریب یا دوست یا خاندان کے آدمی کا ہے۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے ایک کھلی ہوئی کمزوری بلکہ صریح نافرمانی اللہ اور رسول کی دیکھتا ہے لیکن چپ سادھے رہتا ہے، کیونکہ معاملہ اس کے اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ صاف جانتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے شیخ یا استاد یا مرشد سے صریح زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ محض اس وجہ سے ٹوکنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اپنے استاد یا مرشد کو کیا کہہ اور کیسے کہے۔

اس طرح کے لوگوں کے ذہن کا اور ان کے اس طرزِ عمل کا تجزیہ کیا جائے تو چند باتیں نہایت آشکارا ہو کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح کے لوگ سچی خیر خواہی اور جھوٹی محبت میں امتیاز نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کے مقابل میں شیطان پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ تیسری یہ کہ یہ ارادت و عقیدت کے تقاضوں کو حق سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنے کسی بچے یا کسی عزیز میں ایک خطرناک مرض کے آثار پا رہا ہے لیکن وہ محض اس خیال سے اس کو زبان پر نہ لائے یا اس کے علاج کی فکر نہ کرے کہ یہ چیز اس کی طبیعت پر بار ہوگی اور اس کو انجکشن اور آپریشن کی تکلیف دہ مراحل سے گذارنا پڑے گا تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ محبت کا تقاضا تو ہے لیکن یہ محض ایک جھوٹی محبت ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ سچی محبت یا بالفاظِ دیگر سچی خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کا نوٹس لیا جائے اور قبل اس کے کہ اس کی بیماری لاعلاج ہو جائے اس کا علاج کر ڈالا جائے، اگرچہ یہ علاج کتنا ہی تکلیف دہ اور ناگوار کیوں نہ ہو۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح سمجھایا ہے کہ بجائے اس کے کہ تمہاری مداہنت اور چشم پوشی سے بگڑ کر تمہارے اہل و عیال خدا کے سخت گیر ملائکہ کی گرفت میں آئیں اور دوزخ کا ایندھن بنیں، تمہاری

سچی خیر خواہی اور سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خود ہی اپنے احتساب اور اپنی تادیب کے نیچے رکھ کر ان کو خدا کی رحمت کا مستحق بناؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۹۔ تحریم)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے، جس پر سخت گیر اور مضبوط فرشتے مامور ہونگے جو خدا کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرینگے، وہی کریں گے جو انہیں حکم ملے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے خدا اور اس کے قانون سے فرار اختیار کیا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم اس کے معاملہ میں جھوٹی شہادت دے کر یا سچی شہادت کو چھپا کر اس کو اللہ سے اور دُور کر دیں اور خدا کے مجرم کی حمایت کر کے خود اپنے آپ کو بھی اس کا مجرم بنا لیں، صحیح راستہ اس کے لیے بھی اور خود ہمارے لیے بھی یہ ہے کہ ہم اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کریں۔ اگر ہم اس کو خدا کے قانون سے بچانے کی ناجائز کوشش کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے معاملے میں خدا سے زیادہ شیطان کے اوپر اعتماد رکھتے ہیں اور اس کو شیطان کے حوالہ کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت کے الفاظ پر خوب اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۱۳۵۔ نساء)

اے ایمان والو! عدل کی محافظت کرنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ یہ شہادت تمہاری اپنی ذات کے یا تمہارے والدین کے یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی شخص امیر ہو یا غریب اللہ کا حق ان دونوں پر سب سے زیادہ ہے تو خواہش کی پیروی کر کے انصاف سے نہ ہٹو، اگر تم کسی کی طرف جھکو گے یا کسی سے اعراض برتو گے تو یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو باخبر رہنے والا ہے۔

یعنی تمہاری شہادت بالکل بے لاگ لپیٹ ہونی چاہیے۔ اس میں اس وجہ سے کوئی فرق ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص ہمارا عزیز اور رشتہ دار ہے اور دوسرا شخص نہیں ہے یا ایک شخص غریب ہے اور دوسرا شخص مالدار ہے۔ کوئی شخص یگانہ ہو یا بیگانہ، امیر ہو یا غریب، خدا کا حق دونوں پر یکساں ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق پر مقدم ہے، اس وجہ سے بجائے اسکے کہ غربت و امارت اور یگانگی و بیگانگی کا لحاظ کر کے کسی پر خدا کا قانون چلایا جائے اور کسی پر نہ چلایا جائے شہادت حق کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں پر اس کو یکساں چلایا جائے کیونکہ خدا اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ سب اسی کے قانون کے تحت جئیں یا مریں۔ خدا کے قانون کے تحت مرجانا اس جینے سے کہیں بہتر ہے جو خدا کے قانون کے تحت نہ ہو۔

یہی حقیقت مخزومیہ عورت کے اس واقعہ سے واضح ہوتی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مخزومیہ عورت نے چوری کی تو قریش کو اسکی بڑی فکر ہوئی۔ وہ اس امر پر غور کرنے لگے کہ اسکے بارے میں کوئی شخص رسول اللہ سے گفتگو کرے بعض لوگوں نے کہا کہ بھلا ایسے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ بن زید کے سوا کس کی مجال ہے کہ حضورؐ کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت کر سکے؛ چنانچہ حضرت اسامہؓ نے حضورؐ سے گفتگو کی حضورؐ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے باب میں سفارش کرنے آئے ہو؛ اسکے بعد آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان کے اندر کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس سے چشم پوشی کر جاتے اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے لیکن خدا کی قسم میں تو اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتا (مسلم۔ بخاری)

اب ان لوگوں کے معاملے کو لیجیے جو شیخ یا استاذ یا مرشد یا لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرنے کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر وجہ غور کیجیگا تو آپ خود محسوس کرینگے کہ ایک سے ایک بڑھکر افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ محسوس تو کریں کہ اپنے شیخ یا استاذ یا لیڈر سے نہایت سخت قسم کی زیادتی ہو رہی ہے لیکن محض اس کا لحاظ اور احترام آپکے لیے اس زیادتی کے خلاف زبان کھولنے سے مانع ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ استاذ یا شیخ کا احترام حق سے بھی زیادہ کرتے ہیں اور شیخ اور استاذ کے احترام کے تقاضوں کو خدا اور رسول کے صریح مطالبات سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے کسی بزرگ میں کوئی غلطی صریحاً دیکھ تو رہے ہیں لیکن آپکی کوئی چھوٹی یا بڑی غرض اس بزرگ سے وابستہ ہے جس کے سبب سے آپکے منہ میں لگام لگی ہوئی ہے اور آپ اس کو ٹوکنے کی جرأت نہیں

کر رہے ہیں۔ اگر یہ وجہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی غرض اور اپنے مطلب کو حق اور سچائی اور خدا اور رسول سب پر مقدم رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو اپنے شیخ یا استاد کے علم اور تقویٰ پر اتنا بھروسہ اور اس کی رائے پر اتنا گہرا اعتماد ہے کہ آپ محسوس تو کرتے ہیں کہ اس کا فلاں فعل یا فلاں قول بالکل حقیقت کے خلاف ہے لیکن محض اس خیال سے اس کو ٹوکنے سے احتراز کریں کہ ایک ایسا صاحب علم و تقویٰ کوئی غلط کام کس طرح کر سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں اس وجہ سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر یہ وجہ ہے تو یہ وہی اندھی تقلید ہے جس میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اپنے بزرگوں اور مشائخ کو ہم پایۂ خدا یا بالفاظ دیگر ارباباً من دون اللہ بنا ڈالا اور اسکے نتیجہ میں حق شناسی کی نعمت سے ایسے محروم ہوئے کہ سورج کی طرح چمکتا ہوا حق بھی ان کو نظر نہ آسکا۔ اس کی چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے لیڈر یا مرشد کی غلطی اور کوتاہی جاننے کے باوجود محض سہل انگاری کے سبب سے حق نصیحت سے تغافل برت رہے ہیں۔ اگر یہ سبب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا حق آپ پر سب سے بڑا ہے آپ اسی کے معاملے میں مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ ایک شخص نے آپ کو تعلیم دی، آپ کی تربیت کی، آپ کو راہ پر لگایا لیکن جب اس نے خود کہیں ٹھوکر کھائی تو بجائے اس کے کہ آپ اس کو دوڑ کر سنبھالتے اور جھپٹ کر اٹھاتے، اس کو چھوڑ کر چلتے بنے، یہ ایک کھلی ہوئی ناسپاسی اور احسان فراموشی ہے۔ پانچویں اور آخری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اس کے ٹھوکر کھا کر گرنے ہی کے متمنی رہے ہیں اور اب جبکہ وہ گر چکا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں اس کو کیچڑ میں لت پت اور دلدل میں پھنسا ہوا دیکھ کر آپ مطمئن ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو یہ ایک بدترین خیانت اور سنگین ترین بے وفائی ہے جو کوئی شخص اپنے کسی بزرگ یا اپنے لیڈر کے ساتھ کر سکتا ہے۔

بہرحال ان میں سے جو وجہ بھی ہو اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ہر وجہ نہایت افسوسناک اور نہایت شرمناک ہے بلکہ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ عقیدے کے اعتبار سے ان کے ڈانڈے شرک سے ملتے ہیں اور اخلاقی گراوٹ کے پہلو سے دیوثیت سے۔ پھر جب آدمی ان پر اس پہلو سے نگاہ ڈالتا ہے کہ ایک مرشد یا ایک پیشوا اور لیڈر کی غلطی محض ایک شخص ہی کی غلطی اور کوتاہی نہیں ہے بلکہ یہ ہزاروں اور لاکھوں کی غلطی اور خرابی کی موجب ہے، اس سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، جماعتوں کی جماعتیں گمراہی کے راستے پر چل پڑتی ہیں، اور بالآخر قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں تو ان کی سنگینی سو گنی بلکہ ہزار گنی بڑھ جاتی ہے۔